سوامی ویویکانند

تصوف اور اسلام

حسین رنداتھانی

خسرو فاؤنڈیشن
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۴

اشاعت: اول
۲۰۲۴ء
تعداد: 500

نام کتاب:
سوامی وویکانند: تصوف اور اسلام

مصنف:
حسین رنداتھانی

مترجم:
ڈاکٹر حفیظ الرحمن

سرورق:
سلام الدین خان

پبلشر:
خسرو فاؤنڈیشن

رابطہ پبلشر:
خسروفاؤنڈیشن
ڈی-319، ڈیفنس کالونی
نئی دہلی-110024
+91-11-47091095

پرنٹنگ:
عبارت پبلی کیشن، نئی دہلی
رابطہ:9015698045

جملہ حقوق خسرو فاؤنڈیشن محفوظ ہیں
© *All Rights Reserved*

Khusro Foundation
D-319 ,Defence Colony, New Delhi-110024
www.khusrofoundation.org
khusrofoundation.del@gmail.com

+91-9318431341
Khusrofounda
Khusro foundation
Khusro_foundation
Khusrofoundation

فہرست

پیش لفظ	5
سوامی وویکانند: تصوف اور اسلام	9
تیرہویں اور چودہویں صدی کے ہندوستان میں تصوف (امیر خسرو کے خصوصی حوالہ سے)	27
ہندوستانی تصوف اصلاح و انضمام کا شاہکار	39
خسرو فاؤنڈیشن: ایک نئی پہل	56

© *All Rights Reserved to Khusro Foundation*

First Published in India by
KHUSRO FOUNDATION
D-319, Defence Colony, New Delhi-110024
+91-11-47091095
www.khusrofoundation.org
khusrofoundation.del@gmail.com

The views and opinions expressed in this book are the author's own and the fact are as reported by them and the publishers are not in any way liable for the same

Khusro Foundation
Asserts the moral right to be identified the Publisher of this book

All rights reserved. No part of this publication may be reproduced, stored in a retrieval system or transmitted in any form or by any means, electronic, mechanical, photocopying, recording or otherwise, without the prior permission of the publisher.

Typeset Setting 16x24scale at
Ibarat Publication

Printed and Bound at
Global Trading Company

پیش لفظ

خسرو فاؤنڈیشن اپنی اشاعتوں کے خوبصورت گلدستہ میں ایک اور انمول اضافہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کررہی ہے۔ زیر نظر کتاب **''سوامی وویکانند، تصوف اورر اسلام''** کے عنوان سے **ڈاکٹر حسین رنداتھانی** کی تصنیف ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں سوامی وویکانند کے اسلام اور تصوف سے متعلق نظریات پیش کئے ہیں۔

اس کتاب کا پہلا باب **''سوامی وویکانند تصوف اور اسلام''** کے عنوان سے ہے۔ جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ سوامی وویکانند نے اسلامی نقطہ نظر سے ویدوں کا مطالعہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ یہ باب اسلام کے بارے میں سوامی وویکانند کے خیالات اور اسلام کے ذریعہ ویدوں کے مطالعہ کرنے

کے ان کے نقطہ نظر پر مرکوز ہے۔

دوسرا باب **''تیرہویں اور چودہویں صدی کے ہندوستان میں تصوف: امیر خسرو کے خصوصی حوالہ سے''** ہے۔اس باب میں امیر خسرو اور ان کی شاعری پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ امیر خسرو کی ہندوستان سے محبت مختلف عوامل سے پیدا ہوتی ہے۔ امیر خسرو ہندوستان کے نباتات و حیوانات، آب و ہوا اور قدرتی مناظر کی جی کھول کر تعریف کرتے ہیں۔ اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ وہ ہندووستان پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلے نبی حضرت آدمؑ جنت سے نکالے جانے کے بعد ہندوستان میں ہی اتارے گئے تھے۔

تیسرا باب **''ہندوستانی تصوف بطور مثالی نظریہ اصلاح و انضمام''** ہے جس میں کہا گیا ہے کہ صلح کل (امن سب کے لئے) کا فلسفہ ایک منصفانہ سماجی نظام کی بنیاد ہے۔صوفیاء کی سادگی اور پرہیز گاری نے عوام کو اپنی جانب راغب کرنے کے لئے مقناطیسی کام کیا۔ یہ باب ہندوستان میں تصوف کی تاریخ اور ارتقاء اور اس مقدس سرزمین میں تصوف کے پھلنے پھولنے میں مدد دینے والے عوامل کا سراغ لگانے کی ایک معنیٰ خیز کوشش ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ اس نکتہ پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ صرف تصوف ہی دنیا میں ابدی امن اور ہم آہنگی قائم کر سکتا ہے۔

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ کتاب اسلام، تصوف اور سوامی

وویکانند کے بارے میں صحیح تصویر کو سامنے لانے میں بنیادی کردار ادا کرے گی اور ہمارے قارئین اس کتاب سے خاطر خواہ استفادہ حاصل کریں گے۔

خسرو فاؤنڈیشن ایسے ادب کو منظر عام پر لانے کے لئے پُرعزم ہے جو محبت اور ہم آہنگی کو پھیلانے اور اتحاد اور تنوع کو فروغ دینے میں کامیاب ہو۔ جیسا کہ سوامی وویکانند کا مشہور قول ہے: **''محبت زندگی ہے اور نفرت موت ہے۔''** لہٰذا! آیئے ہم سب مل کر اپنے ملک اور سماج میں ہم آہنگی اور امن کو ہر حال میں قائم رکھنے کا عہد کریں اور ایسے سماج کی تشکیل کریں جہاں کسی بھی انسان اور شہری کے لئے ہمارے دل ودماغ میں نفرت نہیں بلکہ صرف محبت ہو۔

ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن

کنوینر

خسرو فاؤنڈیشن

سوامی وویکانند: تصوف اور اسلام

سوامی وویکانند ایک بین الاقوامی شخصیت کے حامل روحانی پیشوا تھے جن کی تعلیمات محبت وانسانیت کی دعوت دیتی ہیں۔ سوامی جی نے سناتن دھرم کو دکھاوٹی رسوم سے پاک کرنے کے لئے عظیم جدو جہد کی اوراس کے روحانی پہلوؤں پر زور دیا۔ سوامی جی کا ماننا تھا کہ خدا کی معرفت اور ہندومت کی آفاقیت کے ادراک کا واحد ذریعہ ویدوں اوراپنیشدوں کا بغائر مطالعہ اوران کی تعلیمات پر عمل ہے۔ سوامی جی کی رائے میں اسلام میں خدا اور روحانیت کے تصور کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے بھی ویدوں اور اپنیشدوں کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ وہ وحدت ادیان کے بھی قائل تھے۔ یعنی ان کا کامل یقین تھا کہ ہر مذہب کے بنیادی عقائد یکساں ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔[1] مگر افسوس

صد افسوس کہ ماضی میں چند ایسے بھی متعصب افراد ہوئے ہیں جنہوں نے سوامی جی کے اس فلسفہ کو قصداً پس پشت ڈال دیا اور سوامی جی کو اسلام دشمن ایک کٹر ہندو کے روپ میں پیش کیا۔ حالانکہ اس کے برعکس سوامی وویکانند ایک نہایت ہی شائستہ، مہذب اور تمام مذاہب کا احترام کرنے والی شخصیت تھے۔

سوامی جی واضح طور پر فرماتے ہیں: ''خواہ وہ کسی بھی برادری میں، کسی بھی ملک میں، کسی بھی عقیدے میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی، ہم ان تمام روحانی شخصیات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں جنہوں نے روایتی طور پر ہمیں اپنا پیغام پہنچایا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ خواہ ان کی نسل، جائے پیدائش اور رنگ کچھ بھی ہو، ہم ان تمام مذہبی پیشواؤں کے سامنے سرنگوں ہیں جنہوں نے نسل انسانی کی بے لوث خدمت انجام دی اور فلاحی کاموں میں پیش پیش رہے۔[2] سوامی جی کو اپنے ہندو ہونے پر فخر تھا جس کا برملا اظہار انہوں نے شکاگو میں عالمی مذہبی پارلیامنٹ کے دوران اپنے شہرہ آفاق خطاب میں کیا۔ وہ فرماتے ہیں: ''مجھے اس مذہب سے تعلق رکھنے پر فخر ہے جس نے دنیا کو رواداری اور ہمہ گیریت دونوں کا درس دیا ہے۔ ہم نہ صرف عالمگیر رواداری پر بھی یقین رکھتے ہیں بلکہ ہم تمام مذاہب کو حق تصور کرتے ہیں۔[3] مذہبی اختلافات کے متعلق سوامی جی فرماتے ہیں:

> ''خدا کی معرفت کے بے شمار راستے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ
> میری اور آپ کی راہیں بالکل مختلف ہوں مگر سب کی

منزل ایک ہی ہے ۔ یہ خیال کہ سب کو ایک ہی مذہب پر عمل کرنا چاہیے، خطرناک ہے ۔جب ہر کوئی مذہب کے بارے میں ایک ہی رائے رکھتا ہے اور ہر کوئی خدا تک پہنچنے کے لیے ایک ہی راستہ تلاش کرتا ہے تو یہ رویہ انتہائی تباہ کن ہے کیوں کہ اس سے مذہبی افکار اور نظریات میں تنوع ختم ہو جاتا ہے ۔ یہ فضول ہے اور اس سے بہر کیف خود کو بچانا چاہیے ۔ایسے متعصب لوگ جو دوسروں کے مذہب کو غلط قرار دیتے ہیں ان کی جانب سے امن و محبت کی بات عبث ہے ۔ ان کی شیریں کلامی بے سود ہے ۔خواہ کوئی عیسائی ہو، بدھ مت کا پیروکار ہو یا پھر اسلام کا ماننے والا ہو ہمیں کسی سے جنگ و جدل کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ۔[4]‘‘

1893 کے مشہور خطاب کی صدی تقریبات کے سلسلہ میں لندن میں واقع لندن اسکول برائے مشرقی اور افریقی مطالعات نے نومبر 1993 میں ایک خاص ورکشاپ کا انعقاد کیا۔ اس ورکشاپ میں تمام شرکاء متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ سوامی جی کو ایک متعصب اور اسلام دشمن ہندو کے طور پر پیش کرنے کی ناپاک سازش بے بنیاد ہے اور شواہد کے برخلاف ہے۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی سے تعلق رکھنے والے تپن رائے چودھری نے دعویٰ کیا کہ دراصل سوامی

وویکانند کا شمار ان دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہند۔اسلامی ثقافت کو ہندی تمدن کا اٹوٹ انگ قرار دیا ہے۔سوامی وویکانند کی شاگرد دسسٹر نویدیتا بیان کرتی ہیں کہ سوامی جی مغل دور کی فنی وراثت کے صمیم قلب سے قدردان تھے۔اپنے مضمون ''ہند کا مستقبل'' میں سوامی وویکانند صراحت کرتے ہیں:

> ''مسلم دور حکومت درحقیقت مظلوموں اور پسماندہ طبقات کے لئے آزادی کا پروانہ لے کر آیا۔یہی سبب ہے کہ تقریباً بیس فیصد ہندو آبادی دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی۔یہ خیال کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا سراسر حماقت کے سوا اور کچھ نہیں''۔[5]

سوامی وویکانند اصرار کرتے ہیں کہ ویدوں میں مذہبی تنوع کو اچھا تصور کیا گیا ہے۔

> ''چاہے آپ عیسائی ہوں، بدھ مت کے پیروکار ہوں، یہودی ہوں، ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا پھر کسی دیگر مذہب کے پیروکار ہوں مگر صرف وید ہی ہیں جن میں ان سب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تمام پیغمبر اور انبیاء اسی کے مظاہر ہیں۔[6] ان کے نزدیک وسیع المشربی ہی ایک واحد قدر ہے جس سے تمام مذاہب کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔تشدد، خونریزی اور بربریت پر قابو

پائے بغیر اصلاح ناممکن ہے۔کسی بھی قسم کی اصلاح کے لئے وسیع المشربی لازمی شرط ہے۔اس وسیع المشربی کا پہلا قدم دیگر مذاہب کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھنا ہے۔بلکہ اگر ہمارے بنیادی عقائد بھی مختلف ہوں تب بھی انسانیت کا تقاضہ ہے کہ ہم ہر شخص کی بلا تفریق مذہب وملت ہر ممکن مدد کریں۔اور اسی فلسفہ پر ہم ہندوستان میں عمل پیرا ہیں۔ماضی میں ہندوؤں نے مساجد اور گرجا گھر تعمیر کئے۔ایک پرامن اور صالح معاشرہ کی تعمیر کے لیے ہمیں یہی سب کرنا ہوگا''۔7

سوامی وویکا نند کے گرورام کرشن پرم ہنس (1836-1886) نے بھی مذاہب کی عالم گیریت کا فلسفہ اختیار کیا تھا۔ان کا مشہور قول ہے:

''درحقیقت تمام مذاہب ایک ہی خدا کی معرفت کے مختلف راستے ہیں''۔

وہ مزید فرماتے ہیں:

''مورتی پوجا، بے شکل خدا کا تصور، وحدانیت، بہت سارے خداؤں کو ماننا سب دراصل ایک ہی خدا تک پہنچنے کے طریقہ ہیں''۔8

پرم ہنس کے شاگرد وویکا نند نے ہندوستان کے طول وعرض کا سفر کیا اور

مسلم علماء سے اسلام اور ہندو دھرم کے متعلق تفصیلی گفتگو کی۔ جس کے بعد انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام اور ہندومت کے درمیان محض فروعی اختلافات ہیں جبکہ دونوں کے بنیادی عقائد یکساں ہیں۔ سوامی وویکانند مانتے تھے کہ قومی نصب العین چونکہ زمانہ قدیم کے سادھوسنتوں کی تعلیمات سے اخذ کیا گیا ہے لہٰذا فطرتاً یہ ہندو ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کو قومی نصب العین اور ہندوستانی اسلام آپس میں متصادم نہیں نظر آتے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ سوامی جی کے کسی شاگرد نے مغل شہنشاہ شاہجہاں کو "غیر ملکی" کہہ دیا۔ اس پر سوامی جی کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے اس شاگرد کی گوش مالی کرتے ہوئے کہا:

"یہ فقرہ سن کر شاہجہاں کی روح قبر میں تڑپ گئی ہوگی"۔[9]

امریکی مصنف کرسٹوفر ایشروڈ سوامی جی کا ایک قول نقل کرتے ہیں:

> "محمد ﷺ مساوات کے علم بردار تھے۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اسلام میں کیا اچھائی ہے؟ تو میرا صاف جواب یہ ہے کہ اگر اسلام میں اچھائی نہ ہوتی تو وہ اب تک باقی کیسے رہتا۔ صرف اچھائی ہی باقی رہتی ہے، صرف اچھائی ہی زندہ رہتی ہے۔ اسلام میں بہت ساری اچھائیاں موجود ہیں"۔

محمد ﷺ نے سیرت طیبہ سے ثابت کر دکھایا کہ اسلام میں مساوات اخوت بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسلام میں ذات، پات، نسل، رنگ اور جنس پر مبنی

کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ تو ممکن ہوسکتا ہے کہ ترکی کا سلطان افریقہ کے بازار سے کوئی حبشی غلام خرید کرزنجیروں میں جکڑ کر ترکی لے آئے مگر اگر وہ غلام مسلمان ہوجاتا ہے اور اس میں تقویٰ اور خدا ترسی موجود ہے تو عین ممکن ہے کہ وہ غلام سلطان کی ہی بیٹی سے نکاح کر لے۔ اس کے برعکس ذرا غور فرمایئے کہ حبشیوں اور امریکی ہندوستانیوں کے ساتھ امریکہ میں کس قدر غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن جیسے ہی کوئی شخص اسلام قبول کرتا تو سابقہ تمام امتیازات ختم ہوجاتے ہیں۔ اسے ہر مسلمان اپنے بھائی کے طرح کھلے ہاتھوں سے قبول کرتا ہے۔ یہ مساوات صرف مذہب اسلام میں ہی پائی جاتی ہیں دیگر مذاہب میں نہیں۔ اگر کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے تو ترکی کا سلطان اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کو کسر شان نہیں سمجھتا۔ اگر نومسلم باصلاحیت اور ذہین ہے تو کوئی بھی عہدہ اس کے لئے مانع نہیں ہے۔ مگر میں نے اب تک امریکہ میں ایک بھی ایسا گرجا گھر نہیں دیکھا جہاں ایک حبشی اور ایک گورا ایک ساتھ مل کر عبادت کرتے ہوں۔

یہ سراسر کذب بیانی ہے کہ مسلمان لوگ خواتین کو انسان تصور نہیں کرتے ۔ میں خود تو مسلمان نہیں ہوں ہاں البتہ میں نے اسلام کا مطالع کیا ہے۔ اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پورے قرآن کریم میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اسلام عورتوں کے خلاف ہے۔

اسلام پر ویدوں کی حریت کا بہت گہرا اثر ہے۔ ہندوستان کا اسلام دنیا کے دیگر ممالک میں پائے جانے والے اسلام سے کافی مختلف ہے۔ جب دنیا

کے مختلف مقامات سے مسلمان ہندوستان آئے تو انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ سلوک کے آداب سکھلائے ...گویا عملی آدی ویدا...جو کہ ابھی ہندوؤں کو سیکھنا باقی ہے۔لہٰذا ہمیں کامل یقین ہے کہ ویدی نظریات...خواہ کتنے ہی دل نشیں اور خوب صورت ہی کیوں نہ ہوں...عملی اسلام کے بغیر یہ سب بنی نوع انسانی کے لئے بے کار اور لایعنی ہیں۔ ہمارا مادر وطن ہندومت اور اسلام کا حسین سنگم ہے۔۔۔ویدا اس کا باطن اور اسلام اس کا ظاہر ہے۔ میں اپنی چشم باطن سے صاف دیکھ سکتا ہوں کہ اس طوائف الملوکی سے ہندوستان بہت جلد ہی نجات حاصل کر لے گا اور ایک مضبوط اور خود مختار ہندوستان بن کر کرہ ارض پر ابھرے گا جس کی جان ویدا اور جسم اسلام ہوگا۔[10]

سوامی جی کے مطابق اسلام نے عیسائیوں میں پادریوں کے خاتمہ میں اہم کردار نبھایا ہے۔عیسائیوں کے پروٹسٹنٹ فرقہ پر اسلام کے کافی گہرے نقوش ہیں۔سوامی وویکانند کی نظر میں وہ سبھی ملعون و مطعون ہیں جنہوں نے بزور تلوار مذہب کی اشاعت کی۔ انہوں نے اسلام اور عیسائیت کے نام پر ہوئے تشدد کی شدید مذمت کی۔لیکن وہ بخوبی واقف تھے کہ زبردستی کسی کو نہ تو مسلمان کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی عیسائی۔لوگ اسلام میں اس کی مساوات کے سبب داخل ہوئے جبکہ عیسائیت کے پیغامِ محبت نے لوگوں کو اپنی جانب راغب کیا۔[11]

شکاگو کے اپنے خطاب کے اختتامی کلمات میں اپنے مذہبی تصور کو سوامی

جی یوں بیان کرتے ہیں:

''مذہب کا معاملہ بھی یہی ہے۔کسی عیسائی کو ہندو یا بدھسٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ایک ہندو کو بدھسٹ یا عیسائی مذہب اختیار کرنے کی کوئی احتیاج ہے۔ بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ اپنے اپنے مذہب پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے دوسرے مذاہب کا احترام کرنا چاہیے اور ان کی روح کو اپنے اندر جذب کرنے کی کاوش ہو۔اس عالمی مذاہب پارلیامنٹ سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔اس نے ہمیں دکھلا دیا کہ تقدس، نظافت اور سخاوت پر کسی ایک مخصوص مذہب کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ ہر مذہب اور ہر فرقے نے اعلیٰ کردار و اخلاق اور اوصاف حمیدہ کے حامل افراد پیدا کئے ہیں۔ان حقائق کے باجود اگر کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلاء ہے کہ صرف اور صرف اس کا ہی دین باقی رہے گا اور دیگر تمام مذاہب فنا ہو جائیں گے تو یہ محض خام خیالی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔مجھے ایسے ناسمجھ آدمی کی عقل پر ترس آتا ہے اور میں ایسے شخص کو بتلانا چاہتا ہوں کہ بہت جلد ہی ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ ہر مذہب کے علم پر جلی حروف میں یہ

عبارت تحریر ہوگی ''مدد کرو جھگڑو نہیں''، ''ایک ہو جاؤ تفرقہ نہ ڈالو''، ''امن وسکون نہ کہ تباہی و بربادی''۔[12]

میری نظر میں تمام مذاہب دراصل ایک خدا تک پہنچنے کا مختلف ذریعہ ہیں جو بنی نوع انسانی کی فلاح کے لئے کام کر رہے ہیں۔ان میں سے نہ تو کوئی فنا ہوسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔جیسے کہ آپ قدرت کی کسی بھی قسم کی قوتوں کو ختم نہیں کر سکتے ٹھیک اسی طرح آپ ان روحانی قوتوں کو بھی ختم نہیں کر سکتے۔آپ نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہے کہ تمام مذاہب زندہ و تابندہ ہیں۔وقتاً فوقتاً کبھی کوئی مذہب زوال پذیر ہوتا ہے مگر پھر چند ہی لمحوں میں خود کو سنبھال کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔بعض اوقات چند سرپھرے افراد اپنی ناپاک حرکتوں سے مذہب کے وقار کو مجروح ضرور کرتے ہیں مگر اس کی روح اپنی جگہ برقرار رہتی ہے اور یہ ہمیشہ رہے گی اس کو کبھی بھی ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

کسی بھی مذہب کا نصب العین کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتا۔اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ہر مذہب بتدریج ترقی کرتا رہتا ہے۔[13] اپنے اسی خطاب کے دوران سوامی جی نے اسلام کے متعلق فرمایا:

''اسلام ہی کی مثال لے لیجئے۔عیسائی جتنی اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں اتنی کسی اور سے نہیں۔ان کی نظر میں اسلام دنیا کا سب سے خراب مذہب ہے۔

> دوسری جانب آپ اس متعصبانہ سوچ سے ہٹ کر ذرا غور کریں کہ جیسے ہی کوئی انسان کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوتا ہے تو بلاتفریق ہر مسلمان اس نومسلم کو کھلی باہوں سے اپنے بھائی کی طرح قبول کرتا ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں ایسی رواداری ناپید ہے۔ ذرا غور کیجئے اسلام میں تمام مسلمان برابر ہیں اور یہی خاصیت ہے محمد ﷺ کی کہ انہوں انسانی مساوات کو مذہب اسلام کا خاصہ بنایا۔ قرآن کریم میں بعض مقامات پر زندگی کو نہایت دلفریب انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس پر دھیان نہ دیں۔ اصل توجہ دینے کی بات یہ ہے کہ اسلام نے اخوت و بھائی چارے کی لاثانی مثال پیش کی ہے۔ یہی اسلام کا بنیادی اساسہ ہے۔ دنیاوی زندگی اور جنت کے بارے میں جو کچھ ہے وہ محض مبالغہ آرائی ہے"۔ [14]

1898 میں محمد سرفراز حسین کے نام اپنے ایک مکتوب میں سوامی جی نے ویدانتا کی تشریح کرتے ہوئے اسلام کی اس معاملہ میں تعریف کی تھی۔ وہ رقم طراز ہیں:

> "خواہ ہم اسے ویدانتا کے نام سے موسوم کریں یا کسی اور "ازم" سے پکاریں سچی بات تو یہ ہے کہ آدی وید ہی تمام

مذاہب کا حرف آخر ہے ۔ یہ وہی اعلیٰ مقام ہے جہاں
سے ہم ہر مذہب اور فرقہ کو محبت اور احترام کی نگاہ سے
دیکھ سکتے ہیں ۔ میرے خیال میں یہ مستقبل کی ہدایت
یافتہ انسانیت کا مذہب ہے ۔ اس اعلیٰ مقام پر سب سے
پہلے پہنچنے کا سہرا گو کہ ہندوؤں کے سر جاتا ہے کیوں
کہ یہودیوں اور عربوں کے مقابلہ یہ زیادہ قدیم نسل
ہیں، مگر بدقسمتی سے ہندوؤں میں عالمی طور پر اس عملی
آدی ویدازم کا فقدان پایا جاتا ہے ۔ لیکن میری نظر میں
اگر کوئی مذہب مساوات کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز
ہے تو وہ صرف اور صرف مذہب اسلام ہے ۔[15] لہٰذا
مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی تردد محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ
ویدانتا کے نظریات خواہ کتنے ہی انسان دوست اور
خوبصورت کیوں نہ ہوں مگر عملی اسلام کے بغیر بنی نوع
انسانؑ کے لئے بے سود ہیں''۔[16]

سوامی جی ہندوستان کی روحانی اقدار سے بخوبی واقف تھے اسی لئے وہ آزادی کی قومی تحریک میں ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے۔ لہٰذا انہوں نے انگریزوں کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا کئے گئے اختلافات کو ختم کرنے کی حتیٰ المقدور کاوش کی۔[17] اسلام کی حقانیت کو اجاگر

کر کے وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان خلاء کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اپنے مذکورہ مکتوب میں سوامی جی مزید کہتے ہیں:

”ہم ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھ رہے ہیں جہاں نہ تو صرف وید ہی ہوں، نہ صرف انجیل مقدس ہو اور نہ صرف قرآن پاک ہی ہو بلکہ ان سب کا ایک حسین سنگم ہو جس میں ان تمام مذہبی کتب کی تعلیمات کو ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہو۔ عالم انسانیت کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ مذاہب وحدانیت کے مختلف مظاہر ہیں اور ہر کسی کو اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کی کھلی آزادی ہے“۔[18]

بلا تفریق مذہب و ملت سوامی وویکانند کے لیے مساوات ہی مثالی معاشرہ کا اہم ترین ستون ہے۔ مگر اس کے قطعاً یہ معنی نہیں کہ ہر انسان دوسرے انسان کے ہم پلہ ہے۔ انہوں نے یہ صاف بتایا ہے کہ اگر تمام طرح کے امتیازات ختم کر دیئے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ ہلاکت و تباہی ہوگا۔ اور خود سوامی جی بھی ان اختلافات کو ختم کرنے میں نا کام رہے۔

”یہ تصور کہ ایک انسان دوسرے انسان سے پیدائشی طور پر اعلیٰ ہے کی ویدانت میں کوئی جگہ نہیں ہے“۔ اپنے متبعین سے خطاب کرتے ہوئے سوامی جی نے فرمایا،

”دوسرے مذاہب کے رسوم و رواج کو اپنے معیار پر

مت تولو''۔سوامی جی خود بھی ہندو مذہب کی بہت ساری رسوم کے زیادہ گرویدہ نہ تھے۔مثلاً وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ گنگا میں اِسنان کرنے سے انسان کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔اگر واقعی میں ایسا ہوتا تو مچھلی سب سے پاک مخلوق ہوتی۔وہ انگریزوں کے خلاف مہم چھیڑنا چاہتے تھے تاکہ آزادی کی تحریک کوتقویت ملے۔مسلمانوں اور انگریزوں کا موازنہ کرتے ہوئے سوامی جی کہتے ہیں،

''آپ ذرا ہندوستان پرغور فرمائیں۔ہندوؤں نے کیا کیا چھوڑا ہے۔۔۔ہر طرف خوب صورت مندر ہی مندر۔مسلمانوں کی کیا وراثت ہے؟ خوب صورت مقامات۔انگریزوں نے کیا چھوڑا؟ شراب کی شکستہ بوتلوں کے انبار کے سوا کچھ نہیں''۔[19]

سوامی جی یورپی نشاۃ ثانیہ میں اسلام اور عربوں کے کردار کی صمیم قلب سے قدر کرتے تھے۔رومن سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی پورے یورپ میں علم کی روشنی بجھ گئی اور وہ جاہلیت کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گیا۔مگر پھر یورپ میں اسلام کا آفتاب طلوع ہوااور یورپ میں علم کی روشنی پھیل گئی:

''اسلام یورپ میں مشرق سے مغرب تک پھیل گیااور پھر ظلمت واندھیرا چھٹ گیااور علم کی نئی شمع روشن ہوئی''۔[20]

ستم ظریفی یہ ہے کہ اسلام کے متعلق ان تمام مثبت افکار و خیالات کے باوجود چند متعصب افراد سوامی جی کو فقط ہندوؤں کے مذہبی رہنماء تک ہی محدود کر دیتے ہیں اور انہیں ایک مسلم مخالف سنت کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان پر تہمتیں لگائی جاتی ہیں اور ان سے جھوٹے قول منسوب کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ''مسلمان اس معاملہ میں سب سے خراب قوم ہے اور ساتھ ہی سب سے زیادہ فرقوں میں بٹی ہوئی بھی۔ ان کے پاس سب کو جانچنے کا بس ایک ہی پیمانہ ہے: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ اور جو کوئی مرد و عورت اس پر یقین نہیں رکھتا وہ واجب القتل ہے؛ جو کچھ بھی اس اسلامی عبادت کے دائرہ سے باہر ہے اسے فوراً مٹا دینا چاہیے، جو کتاب بھی اس کے سوا درس دیتی ہو اسے فوراً جلا دینا چاہیے۔ بحر الکاحل سے لیکر بحر اوقیانوس تک مسلسل پانچ سو برسوں تک خون کی ندیاں بہی ہیں۔ بس یہی اسلام ہے۔[21]

''اس کرہ ارض پر اسلام سے زیادہ دوغلہ مذہب کوئی نہیں
ہے۔ اور جتنی زیادہ قتل و غارت گری مسلمانوں نے کی ہے
اس سے زیادہ دنیا کی کسی قوم نے نہیں کی۔ قرآن میں بارہا
کافروں کو قتل کرنے کا حکم ہے''۔[22]

یہ اور اسی قبیل کے بہت سارے اقتباسات کو لندن (1890) اور کیلی فورنیا (1896) کے خطابات سے نکال کر بے سیاق و سباق پیش کیا گیا ہے۔[23] لیکن یہ تمام اقتباسات ان کی اسلام اور مسلمانوں کے متعلق عام رائے

کے منافی ہیں لہٰذا ان کی تصدیق کی جانی ضرور ہے۔ یہ بات بالکل بھی حلق سے نہیں اترتی کہ سوامی وویکانند جیسا باکمال اور وسیع المشرب سادھو جس نے رام کرشن پرم ہنس کے سامنے زانوئے تلمذ بچھایا ہو وہ اسلام کے متعلق اس قدر زہر اگلے گا۔ یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ اتنی عظیم المرتبت شخصیت کے وقار کو چند فرقہ پرست عناصر مجروح کر رہے ہیں۔ جبکہ گاندھی جی بھی سوامی وویکانند کی انسان دوستی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

❑❑❑

References:

1.For details, Green Message, Swami Vivekananda,https:// greenmesg.org/swami_vivekananda_sayings_quotes/religion-religious_harmony.php

2 .*Vivekananda Sahitya Samgraham*, Sreeramakrishna Matam, Thrissur, 1992,p.417

3. https://www.artic.edu/swami-vivekananda-and-his-1893-speech

4 .*Vivekananda Sahitya Sarvaswam*, Vol.III, pp.26-27

5.Rafiq Zakaria, A Humanism that embraces all, Leader Article, *Times of India*, May, 14,2002

6. Rafiq Zakaria, op.cit.

7. Speech at Kumbha konam, *Vivekananda Sahitya Samgraham*, p.259

8.Mahendra,*Speeches of Sree Rama Krishna*, Rama Krishna Mission, Calcutta

9. For Details see, Govind Krishnan V, *Vivekananda, The Philosopher of Freedom*, Aleph Books, 2023.

10.Christopher Isherwood, Teachings of Swami Vivekananda, Introduction, quoted by DilipRaote, *Hidustan Times*, 25-7- 2007

11. Gopal Sreenivas Banhatti, *Life and Philosophy of Swami Vivekananda*, Delhi,1989, p.177

12. https://www.artic.edu/swami-vivekananda-and-his-1893-speech

13. "The way to the realisation of a universal religion" (Delivered in the Universalist Church,Pasadena, California, 28th January 1900), *The Complete works of Swami Vivekananda*,Vol.2, Practical Vedanta and Other Lectures

14. Ibid,http://en.wikisource.org/wiki/The_Complete_Works_of_SwamiVivekananda/Volume_2/Practical_Vedanta_and_other_lectures/The_Way_to_the_Realisation_of_a_Universal_Religion,pp.371-72

15. *Complete works of Swami Vivekananda, Vol.VI* , p. 415, PR.Bhuyan (ed.), *SwamiVivekananda; Messiah of Resurgent India*, 174groups.yahoo.com/group/IndiaSeminar/message/1951;Swami Vivekananda "Brain and Body,Letters dated Almora, June,10 1898

16. *Vivekananda Sahitya Samgraham*, Letters, p. 658

17. Ibid.

18. Ibid., p.416

19. Ibid.,p.184

20. *Vivekananda Sahitya Samgraham*, p. 614

21. Ibid, p.26

22. *Complete works of Swami Vivekananda,* Practical Vedanta,Part,4, Vol.II, Ibid.,pp.352-53

23. At Shakespear Club of Padasena in California on 3 February 1900. And in London 18; November 1896 as given in the complete works.

تیرہویں اور چودہویں صدی کے

ہندوستان میں تصوف

(امیر خسرو کے خصوصی حوالہ سے)

تصوف عالم اسلام میں عرصہ دراز سے موجود ہے۔مگر تصوف اس وقت منظم ہوا جب روحانی سلاسل یا ''طریقہ'' وجود میں آئے۔نتیجتاً پوری دنیا میں صوفیاءکرام کا ایک نیٹ ورک پھیل گیا۔ان صوفی سلاسل میں صوفی کے جانشین ''خلیفہ'' کہلاتے ہیں۔ جو اپنے شیخ کی تعلیمات کوعوام الناس تک پہنچاتے ہیں۔ یہ وہی وقت تھا جب بڑے بڑے صوفیاءکرام نے سرزمین ہند پر قدم رنجا فرمائے۔ان کی فیوض و برکات آج بھی جاری اور ساری ہیں۔

سلطان محمد غوری کے دور حکومت 1206 میں خواجہ معین الدین چشتیؒ

افغانستان سے ہندوستان تشریف لائے اور راجستھان کے ایک دور دراز علاقہ اجمیر میں سکونت اختیار کی۔[1] تقریباً تین عشروں تک آپ لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچاتے رہے۔عوام الناس جوق در جوق آپ سے دعائیں کرواتے اور روحانی فیض حاصل کرتے۔آپ کے اعلیٰ کردار عمدہ اخلاق سے متاثر ہوکر کثیر تعداد میں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔خواجہؒ صاحب نے 1236 میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔آپ کے وصال کے بعد آپ کے مریدین نے ایک شاندار مزار تعمیر کروایا جو کہ آج بہت بڑا روحانی مرکز ہے۔حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی مزار کو ہندوستان کی اولین مزار ہونے کا شرف حاصل ہے۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے مریدین کو ملک کے مختلف حصوں میں دعوت وتبلیغ کے لئے بھیجا۔خواجہ صاحبؒ کے ایک شاگرد شیخ حمیدالدین ناگوری نے ناگور کے علاقہ میں سکونت اختیار کی۔آپ نے وہاں کے مزدوروں کے ساتھ مل کر کاشت کاری کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اصلاح اور روحانی رہنمائی بھی جاری رکھی۔جب محمد بن تغلق نے بام سلطنت سنبھالی تو اس نے شیخ کا مقبرہ تعمیر کروایا اور ساتھ ہی ایک خانقاہ بھی تعمیر کروائی۔

تیرہویں صدی کے اوائل میں وسطی ایشیاء اور ایران فتنہ منگول سے نبرد آزما تھے۔ اس وقت وہاں سے صوفیاء کرام ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے۔یہاں ان کا فراخ دلی سے استقبال کیا گیا اور انہیں دعوت وتبلیغ کے لئے موزوں فضاء میسر کی گئی۔سلطان التمش نے دہلی میں قوت الاسلام مسجد

تعمیر کروائی اور اس کے احاطہ میں خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ خواجہ بختیار کا کیؒ، کو اشاعت اسلام کی دعوت دی۔ حضرت کا کیؒ کے ہاتھ پر ہزارہا لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ حضرت کا کیؒ کے نو شاگردوں میں سے حضرت بابا فرید اجودھن میں سکونت پذیر ہوئے جبکہ بقیہ آٹھ دہلی اور دہلی کے گردونواح میں بس گئے۔

شیخ فرید کے شاگردوں کی تعداد کافی کثیر ہے۔ ان میں سے اکثر نے اپنی خود کی سلسلہ چشت کی خانقاہیں قائم کیں۔ ان تمام میں حضرت نظام الدین اولیاء سرفہرست ہیں۔ بلکہ یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ حضرت نظام الدین اولیاء چودہویں صدی کے سب سے عظیم صوفی ہیں۔ انہوں نے سلسلہ چشت کو جلا بخشی۔ آپ کے شاگردوں نے شمالی اور وسطی ہندوستان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا تعلق بدایوں سے تھا۔ آپ غربت وافلاس میں زندگی بسر کررہے تھے اور بسا اوقات دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ دہلی میں آپ کا قیام اکثر امیر خسرو کے نانا عمادالملک کے یہاں رہتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ مستقل رہنے کے ٹھکانے کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے تھے۔ حالانکہ ان کے متعلقین ان سے درخواست کرتے تھے کہ وہ سلطان بلبن سے مل کر اپنا مدعا بیان کریں مگر ان کی غیرت ایمانی نے انہیں کبھی دست ضرورت دراز کرنے کی اجازت نہ دی۔

جب 1290 میں سلطان جلال الدین تخت نشین ہوا تو اس نے حضرت

نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں ایک خطیر رقم بطور ہدیہ بھیجی اور ساتھ یہ بھی پیغام بھجوایا کہ بہت جلد انہیں کئی گاؤں پر مشتمل جاگیر عطا کی جائے گی۔مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اس فانی دنیا سے کوئی لگاؤ نہ تھا سو انہوں نے معذرت کرلی۔[2] سلطان علاء الدین خلجی کے دور تک حضرت نظام الدین اولیاء کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاء کے زائرین کے لئے سرائے بنوائی اور دیگر سہولیات بھی فراہم کیں۔ اگرچہ سلطان علاء الدین خلجی کے جانشینوں کے حضرت نظام الدین اولیاء کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں تھے۔مگر اس کے باوجود وہ حضرت نظام الدین اولیاء کو دہلی سے باہر نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے 1325 میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔سلطان محمد بن تغلق نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اعزاز میں ایک شاندار درگاہ تعمیر کی جہاں مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہی ذیارت کے لئے آتے ہیں۔

طوطی ہند امیر خسرو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے شاگرد و مرید خاص تھے۔آپ کے آباواجداد سلطان التمش کے دورِ حکومت میں وسطی ایشیاء کے علاقہ بلخ سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔حضرت امیر خسرو نے بہت کم عمری میں ہی عربی، فارسی، ہندوی اور دیگر مشرقی علوم میں مہارت حاصل کر لی تھی۔کم سنی سے ہی شاعری شروع کردی تھی۔وہ بیک وقت شاعر، مورخ اور صوفی تھے۔آپؒ نے پانچ پانچ مثنویاں سلطان علاءالدین خلجی کی مدح میں

کہیں۔ ستار جیسے مقبول آلہ موسیقی کی ایجاد بھی آپؒ سے منسوب ہے۔ مزید آپؒ نے کئی راگ بھی ایجاد کئے جن کا استعمال محفل سماع میں کثرت سے ہوتا ہے۔ جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا وصال ہوا تو امیر خسرو سلطان محمد بن تغلق کے ہمراہ سفرِ بنگال پر تھے۔ جب امیر خسرو کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے انتقال پرملال کی خبر ہوئی تو وہ بلاتاخیر دہلی واپس آئے اور حضرت نظام الدین اولیاء کی قبر پر کھڑے ہو کر نم دیدہ آنکھو سے یہ اشعار پڑھے[3]:

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسروؔ گھر آپنے رین بھئی چھوں دیس

امیر خسرو پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے انتقال کا بہت زیادہ اثر ہوا اور اس کے بعد وہ محض چھ ماہ ہی اور حیات رہے۔ ستمبر 1325 میں آپ اپنے پیرومرشد سے جا ملے۔

موسیقی کا امیر خسرو کی زندگی میں بہت اہم کردار ہے۔ موسیقی میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کا سلسلہ کہیں نہ کہیں سے امیر خسرو سے نہ ملتا ہو۔ حتیٰ کہ صوفیاء کا رقص بھی امیر خسرو کی دین ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے زمانہ میں محفل سماع میں رقص کی اجازت نہیں تھی۔ مگر ایک بار کا واقعہ ہے کہ محفل میں سماع میں امیر خسرو کو حال آگیا اور انہوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ اس پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے امیر خسرو سے فرمایا، ''رقص کرتے وقت ہاتھ اوپر آسمان کی جانب اٹھاؤ گویا تم اللہ سے طالب دعاء ہو اور تمہارے قدم زمین

پر گڑے رہنے چاہئیں گو یا یہ دنیا تمہاری نظروں میں حقیر ہے''۔یہی وجہ ہے کہ جب صوفی رقص کرتے ہیں تو ان کے ہاتھ اوپر آسمان کی جانب ہوتے ہیں اور ان کے پیر زمین پر دب دب کر رہے ہوتے ہیں۔

امیر خسرو کو ہندوستان کی بود و باش اور آب و ہوا سے عشق تھا۔ ان کے نزدیک ہندوستان پوری دنیا کا سب خوب صورت ملک ہے۔ اپنے اس کلیہ کی دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ جب حضرت آدمؑ کا جنت سے خروج ہوا تو انہیں سرزمین ہند ہی میں اتارا گیا۔[4] کیوں کہ اگر انہیں خراسان یا صحرائے عرب یا پھر چین میں بھیجا جاتا تو وہاں کی سخت اور شدید آب و ہوا میں وہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں جی سکتے تھے۔

حضرت امیر خسرو کے علاوہ بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے بے شمار شاگرد ہوئے۔ ان میں شاعری میں حسن سنجری، مؤرخ ضیاء الدین برنی اور تصوف میں شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کے نامِ نامی قابل ذکر ہیں۔ دہلی میں حضرت نظام الدین کے خلیفہ شیخ نصیرالدین چراغ تھے۔ جب محمد بن تغلق نے دارالسلطنت کو دہلی سے دولت آباد منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے حضرت شیخ نصیرالدین چراغ سے بھی دولت آباد چلنے کی گزارش کی مگر آپ نے منع فرما دیا اور دہلی میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ محمد بن تغلق کے انتقال کے بعد فروز شاہ تغلق کی تخت نشینی میں شیخ نصیرالدین چراغ نے اہم کردار ادا کیا۔ آپ ''چراغ دہلی'' کے نام سے معروف ہوئے اور 1356 میں آپ کا وصال ہوا اور آپ دہلی میں ہی

مدفون ہیں۔ان کی خانقاہ مرجعِ خلائق ہے۔

سلسلہ چشت کے صوفیاء نے فقر و فاقہ میں زندگی بسر کی۔ ان کے نزدیک دنیا کے مال ومتاع معرفتِ خدا میں رخنہ ڈالتے ہیں۔ وہ روزہ کے ذریعہ نفسانی خواہشات پر قابو پاتے تھے۔[5] وہ بہت قلیل مقدار میں کھانے کھاتے تھے تاکہ بول و براز کی حاجت پیش نہ آئے۔ایک بار شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے کسی نے دریافت کیا،''آپ اتنا کم کھانا کیوں کھاتے ہیں''۔آپؒ نے اپنی غریب پروری کا ثبوت دیتے ہوئے کیا ہی خوبصورت جواب دیا، ''کتنے لوگ رات کومسجدوں اور دوکانوں کے سامنے بھوکے سو رہے ہیں۔ایسے میں میرے حلق سے کھانا کیسے اتر سکتا ہے''۔[6] سلسلہ چشت کے صوفیاء کا معمول تھا کہ وہ کوری زمین پر ہی عبادت وریاضت کرتے اور سوتے۔چھوٹے بڑے سب ایک ساتھ۔اگر کھانا ہوتا تو سب کھاتے اور اگر نہیں ہوتا تو سب بھوکے ہی سو جاتے۔

سلسلہ چشت ہی کی طرح سہروردی سلسلہ کے صوفیاء بھی ہندوستان تشریف لائے۔شیخ بہاءالدین نے ہندوستان میں سہروردی سلسلہ کی داغ بیل ڈالی۔شیخ بہاءالدین اور سلطان التمش میں کافی قربت تھی۔سلطان التمش نے آپ کو شیخ لاسلام مقرر کیا تھا۔آپ کے خلفاء سید نورالدین غزنوی، سید جلال الدین اور قاضی حمیدالدین نے دعوت وتبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔

رفتہ رفتہ تصوف نے ہندوستان میں تحریک کی شکل اختیار کرلی۔جس کا

لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی معاشرہ اخوت اور محبت کا مثالی معاشرہ بن گیا۔ صوفیاء کے نزدیک خدمت خلق ہی معرفت کا ذریعہ ہے۔ پیری مریدی، خانقاہوں کا نظم ونسق، عبادت وریاضت سے مہذب اور مودب انسان وجود میں آئے۔عوام الناس کو خانقاہوں میں روحانی سکون حاصل ہوتا تھا۔صوفیاء کرام بھی عام انسانوں کے ساتھ رہتے تھے اوران کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔صوفیاء نے ریاضت ومشقت سے بعض مافوق الفطرت کمالات حاصل کرلیے تھے جن کا مقصد بقول حضرت معین الدین چشتیؒ ''پریشان حالوں کوتسکین دینا، حاجت مندوں کی حاجت روائی اور بھوکوں کو کھانا کھلانا ہے''۔[7]

چشتی اور سہروردی سلسلہ کے صوفیاء نے حکومت وقت کے ساتھ یکسر مختلف رویہ اپنایا۔ جہاں ایک جانب سلسلہ چشت کے صوفیاء نے سلاطین و امراء سے کنارہ کشی اختیار کی تو وہیں سہروردی سلسلہ کے صوفیاء نے باشاہوں سے خوب تحفے تحائف قبول کئے۔حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی طویل زندگی میں سات سلاطین دیکھے مگر وہ کسی سے بھی ملنے کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔سوائے سلطان جلال الدین کے،جس نے انہیں محفلِ سماع میں موسیقی کے استعمال پر فتویٰ لینے کے لئے طلب کیا تھا۔سلسلہ چشت کے صوفیاء نے حکومتی اعزازات کو بھی ٹھکرادیا حالانکہ بڑے بڑے شہزادگان ان کے مرید ہوا کرتے تھے۔

چودھویں صدی کے اواخر میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ تصوف کا شیرازہ ہندوستان میں بکھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں سے روحانیت فنا ہوتی ہوئی اور دعوت وتبلیغ کے عناصر سرایت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کا ایک پہلو تو اعلیٰ مذہبی اور روحانی اقدار کا فروغ ہے جو کہ خواجہ دیا بخشی اور شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے خطوط سے صاف واضح ہے۔ دوسری جہت ہندوانی رسوم کا اختیار کرنا ہے۔ شیخ فریدالدین اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مراسم ہندو یوگیوں سے تھے جو اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور مذہبی اور روحانی معاملات پر گفت وشنید کیا کرتے تھے۔ شیخ نصیرالدین چراغ نے یوگا سیکھا تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو بھی بعض آسنوں کو کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔[8] سلسلہ چشت کے معروف صوفی شیخ گیسو دراز نے بھی ہندومت کا مطالعہ کیا تھا اور وہ اکثر ہندو مذہبی رہنماؤں سے ہندومت پر بحث ومباحث کیا کرتے تھے۔[9]

جب حضرت نظام الدین اولیاء نے ہندوؤں کو گنگا میں اسنان کرتے اور بھجن گاتے دیکھا تو آپنے یہ شعر کہا:

"ہر قوم راست راہے، دینِ وقبلہ گاہے"

(ہر قوم کا اپنا ایک سیدھا راستہ ہے اور اس کا اپنا دین وقبلہ ہے۔[10])

امیر خسرو نے بھی ہندو مذہبی کتب کا بغائر مطالعہ کیا تھا ان کا مشہور قول ہے:

نیست ہنود اگر چہ کہ دیندار چوما
ہست بسے جائے باقرار چوما
''ارے،تم ہندو کی پوجا پر طنز کرتے ہو،اس سے بھی سیکھو کہ
عبادت کیسے کی جاتی ہے''۔[11]

ہندی بھجنوں نے صوفیاء کو کافی متاثر کیا۔ چودہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ہندؤوں اور مسلمانوں کے درمیان بہت اتفاق پیدا ہو گیا تھا۔ امیر خسرو نے اس معاشی تبدیلی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے زمانہ میں ہندوستانی موسیقی پر کافی مطالعات ہو چکے تھے اور اس کا استعمال محفلِ سماع میں بھی ہونے لگا تھا جس میں ہندو اور مسلم دونوں ہی برابر کے شریک ہوتے تھے۔[12]

❏❏❏

Reference:

1. SAA.Rizvi, *A History of Sufism in India*, Delhi, 1978, p. 122
2. *Siyarul Auliya,* pp.11415
3. He was the most loved disciple of his master. He was so close to his master that once Nizāmuddīn Auliyā' said, "If sharī'ah allows me I would like him to be buried with me in the same grave"
4. For details, See Aziz Ahmad, *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*,1969,p.115-118
5. SAA Rizvi, op.cit.,p.172
6. M.Mujib, Indian Muslims,1971, p.146
7. K.A.Nizami, op.cit.,p.199
8. Ibid.,p. 201
9. M.Mujib, Indian Muslims, Delhi, 1971,p.146.
10. Ibid.,p.165
11. Ibid.,Nuh Sipihr, p.163
12. Indian Muslims ,166

ہندوستانی تصوف

اصلاح وانضمام کا شاہکار

تصوف کے بنیادی اوصاف باطنی طہارت، اعلیٰ اخلاقی اقدار اور روحانی طرز حیات ہیں۔ ہندوستان بھی زمانہ قدیم سے روحانیت کا مرکز رہا ہے۔ ویدوں اور اپنیشدوں میں تصوف کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ ان ہی اسباب کے بموجب اسلامی تصوف کو ہندوستان میں نشوونما پانے کے لئے موافق ماحول میسر آیا۔ ہندوستانی سماج ذات پات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا۔ نچلے طبقات کے لوگوں پر اشراف ظلم کیا کرتے اور ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھتے تھے۔ مگر اسلام میں ذات پات پر مبنی تفریق کا کوئی تصور نہیں تھا۔ صوفیاء کرام بھی اسی فلسفہ پر عمل پیرا تھے۔ خانقاہوں میں بھی کسی قسم کا کوئی بھید بھاؤ

نہیں برتا جاتا تھا۔ ہر کوئی ہر کسی کے ساتھ مل کر رہتا تھا۔ سب کا خورد ونوش ایک جیسا سب کی بود وباش ایک جیسی۔ خانقاہوں کی ان ہی اوصاف حمیدہ نے غیر مسلموں اور بالخصوص نچلے طبقوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

یہ امر قابل غور ہے کہ ہندوستان میں صوفیاء کی آمد مسلمانوں کے سیاسی اقتدار سے کافی پہلے ہوئی تھی۔ صوفیاء نے ہندوستان میں ''صلح کل'' کی پالیسی کو فروغ دیا جس کے سبب کثیر تعداد میں مقامی لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بصریٰ کے معروف صوفی حسن البصری کے شاگرد رشید مالک بن دینار اپنے بہت سے اعزا واقرباء کے ساتھ مالابار تشریف لائے اور یہاں اشاعت اسلام میں مصروف ہو گئے۔ آپ کے بعد تو گویا صوفیاء کا ایک تانتا بندھ گیا اور سرزمین عرب ووسطی ایشیاء سے کثیر تعداد میں صوفیاء ہندوستان تشریف لائے جنہوں نے ہندوستان کے طول وعرض میں خانقاہیں قائم کیں جو دراصل اصلاح معاشرہ کا مرکز تھیں۔

صوفیاء معاشرہ کے نچلے طبقات کے ساتھ مل کر رہتے تھے۔ اس پالیسی کی پشت پر دو عوامل کارفرما تھے: اول یہ کہ وہ ذاتوں میں بٹے ہندوستانی معاشرہ کو اس بندھن سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ دوم یہ کہ اس طرح وہ عوام الناس کے قریب آ کر ان کے قلوب پر فتح حاصل کرتے تھے۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں غوری فتوحات سے تقریباً نصف صدی قبل ہی تصوف سرزمین ہند میں کافی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ بہرائچ میں سید سالار

مسعود کی درگاہ کے قرب و جوار میں خاصی مسلم آبادی پھیل گئی تھی۔ مزید برآں بدایوں میں میران ملحن کی درگاہ، گوپا مئو میں خواجہ مجدالدین بلگرامی اور لالہ پیر کی درگاہیں اور منیر میں امام تقی کی درگاہ تصوف کے اہم مراکز کے روپ میں ابھرے۔

بلا شبہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار نے تصوف کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور صوفیاء نے ملک کے مختلف مقامات پر اپنی خانقاہیں بنائیں۔ مگر بعض اوقات اس کے سبب صوفیاء کو کافی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔[1] ہاں لیکن ایک بار صوفیاء نے اپنا مرکز قائم کرلیا تو پھر ان کے حسن اخلاق، انسان دوستی، سادہ طرز حیات اور مساوات مقامی لوگوں کے دلوں کو بھا گئی'' جبکہ اس کا سیاست اور سیاسی اقتدار سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی'' ایسے وقت میں کہ جب ملک غوری حملوں سے تھر تھر کانپ رہا تھا ایسی مشکل گھڑی میں خانقاہوں نے لوگوں کو پناہ دی۔ صوفیاء پرسکون اپنی جگہ بیٹھے رہے اور محبت و اخوت، انسانیت اور مساوات کا درس دیتے رہے''۔[2] حالانکہ حکماء اور امراء عام لوگوں سے محض غرور و تکبر اور نسلی افتخار کی وجہ سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے اس وقت ان صوفیاء نے غریب و امیر، اشرف و ارذل، مرد و زن اور دیہاتی و شہری کے تمام امتیازات ختم کر ان دھتکارے ہوئے لوگوں کو گلے لگایا اور اپنی خانقاہوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے۔

تقریباً تمام ہی سلاسلِ تصوف کے مراکز اور خانقاہیں ہندوستان میں

پائی جاتی ہیں۔مگر ان میں سب سے ممیز وممتاز سلسلہ چشتیہ ہے۔ مورخین اور محققین نے خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فیوض و برکات کو تفصیلی طور پر قلم بند کیا ہے مگر آپؒ کے بچپن کے حالات کے متعلق معتبر ذرائع سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روحانی کمالات اور کشف لاثانی ہیں۔خواجہ معین الدین چشتیؒ سلسلہ چشت کے معروف صوفی خواجہ عثمان ہارونی کے خلیفہ تھے۔خواجہ معین الدین چشتیؒ کے اکثر سیر نگاروں کا خیال ہے کہ پرتھوی راج چوہان کے دور حکومت میں خواجہ صاب اجمیر آ کر بسے جب کہ مولانا جمالی کا دعویٰ ہے کہ خواجہ صاحب اجمیر اس وقت تشریف لائے جب اسے محمد غوری نے فتح کر کے وہاں کا گورنر قطب الدین ایبک کو مقرر کیا۔[3] حضرت خواجہؒ کے ہاتھ پر ہزار ہا انسانوں نے اسلام قبول کیا۔آپؒ کا وصال مارچ 1236 عیسوی میں ہوا۔آپؒ کے انتقال کے بعد آپ کے شاگردوں اور مریدوں نے ایک شاندار مزار تعمیر کروایا۔جواب مرجع خلائق ہے۔

شمالی ہندوستان میں شیخ حمیدالدین ناگوریؒ (م 1276) اور شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ (م 1235) نے سلسلہ چشت کو فروغ دینے میں اہم کردار نبھایا۔حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے خلیفہ شیخ فریدالدین گنج شکرؒ (م 1265) نے وسطی ہندوستان میں سلسلہ چشت کو آگے بڑھایا۔شیخ فریدؒ کے شاگردوں کی تعداد کافی کثیر ہے۔ان میں سے اکثر نے اپنی خود کی سلسلہ چشت کی خانقاہیں قائم کیں۔ان تمام میں حضرت نظام الدین اولیاء سرفہرست ہیں۔ بلکہ یہ کہنا

قطعاً غلط نہ ہوگا کہ حضرت نظام الدین اولیاء چودہویں صدی کے سب سے عظیم صوفی ہیں۔ انہوں نے سلسلہ چشت کو جلا بخشی۔ تقریباً نصف صدی تک آپؒ نے دہلی میں دعوت و تبلیغ کا کام کیا۔[4] شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ (م 1356)، خواجہ حسین عبدالقدوس گنگوہیؒ (م 1537)، شیخ جلال تانیسوریؒ، شیخ عبدالعزیزؒ، شیخ سلیم چشتیؒ اور شیخ بندہ نواز گیسو درازؒ سلسلہ چشت کے دیگر قابل ذکر صوفیاء ہیں۔

سلسلہ چشت کے صوفیاء فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ نہ ان کا کوئی ٹھکانہ ہوتا تھا اور نہ ہی کھانے کے لئے ڈھنگ کا کھانا۔ اکثر وہ مریدین کا ہدیہ دیا ہوا کھانا ہی کھاتے تھے۔ انہیں سلاطین و امراء سے نفرت تھی حالانکہ حکمران خود ان کی صحبت میں روحانی سکون حاصل کرتے تھے۔ شیخ فرید نے سید مولا کو ہدایت کی تھی:

> ''سلاطین وامراء کو اپنا دوست مت جانیو۔ ان کا خانقاہ آنا گویا روحانیت کا خاتمہ۔ جس بھی درویش نے سلاطین وامراء کے ساتھ دوستی کی اس کا خاتمہ برا ہوا ہے''۔[5]

شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی (م 1182-83) نے ہندوستان میں سہروردی سلسلہ کی داغ بیل ڈالی۔ سلسلہ سہروردیہ کا فلسفہ سلسلہ چشت سے یکسر مختلف تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ انسان کو ایک نارمل اور متوازن زندگی گزارنی چاہیے۔ ایسی طرز حیات جس میں روح اور جسم دونوں کی غذا فراہم ہو۔ نہ تو خود

انہوں نے مسلسل روزے رکھے اور نہ ہی اپنے مریدین اور اقرباء کو فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی۔

سلسلہ چشت کے برخلاف سلسلہ سہروردیہ کے صوفیاء مال و دولت کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ شیخ بہاء الدین کا مشہور قول ہے، ''دولت دل کا مرض ہے مگر جب ہاتھ میں ہوتی ہے تو تمام بیماریوں کا علاج بھی''۔ مزید برآں سلسلہ سہروردی کے صوفیاء سیاست میں سرگرم رہتے تھے۔ شیخ بہاء الدین ایک بہترین منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے سلسلہ سہروردیہ کو ایک مضبوط بنیاد عطاء کی۔ شیخ صدرالدین اور ان کے فرزندارجمند شیخ سید جلال الدین سرخ اور سید جلال الدین مخدومِ جہانین سلسلہ سہروردیہ کے معروف صوفیاء ہیں۔

شیخ حسین جیلانیؒ نے پندرہویں صدی میں اوچھ میں سلسلہ قادریہ کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے فرزند عبدالقادر ثانی، شیخ داؤد، شیخ نوشاہ، میاں میر وغیرہ نے سلسلہ قادریہ کو ملک کے مختلف حصوں میں فروغ دیا۔ شہنشاہ شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا دارشکوہ بھی میاں میر کا مرید تھا۔ داراشکوہ نے تصوف کے موضوع پر بہت کام کیا ہے۔ اپنی شاہکار تصنیف ''مجمع البحرین'' میں داراشکوہ ہندومت اور اسلام کو ایک سورج کی دو مختلف شعاؤں سے تشبیہ دیتا ہے۔

تیسرے مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر (1556-1605) کے دورِ حکومت کے اواخر میں ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ (م 1603) نے

1603 عیسوی میں نقشبندی سلسلہ قائم کیا۔ مغل بادشاہ ظہیرالدین محمد بابر خواجہ عبیداللہ کا مرید تھا جن کا تعلق وسطی ایشیاء کے علاقہ تاشقند کے نقشبندی صوفی سلسلہ سے تھا۔ شیخ احمد سرہندیؒ (م 1624) سلسلہ سہروردیہ کے عظیم المرتب بزرگ اور عالم گزرے ہیں۔ حضرت سرہندیؒ نے اسلام کو مروجہ غیر اسلامی رسوم سے پاک کرنے کی مہم چلائی۔ وہ بادشاہ اکبر کے دین اِلہیٰ کے شدید مخالف تھے۔ جب بادشاہ اکبر نے انہیں عبادت خانہ میں دینی امور پر گفتگو کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے صاف انکار کردیا۔ شیخ سرہندیؒ وحدت الوجود کے قائل نہ تھے اسی لئے انہوں نے وحدت الشہود کے فلسفہ پر زور دیا۔ ان کی دلیل تھی کہ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ سب جگہ خدا موجود ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ سب کچھ خدا کے مظاہر ہیں۔[6]

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ کے سبب یہاں پہلے سے موجود دیگر ثقافتوں اور مذاہب کے ماننے والوں سے خوش گوار تعلقات رکھنا ناگزیر ہوگیا۔ اس لمحہ میں صوفیاء پیش پیش رہے نہ کہ مسلم سلاطین اور امراء۔ اس معاشرتی آمیزش کے نتیجہ میں ایک نئی فضاء قائم ہوئی اور ایک نئی تہذہب نے جنم لیا جسے گنگا جمنی تہذیب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نئے معاشرتی نظام میں ہر مذہب، ہر فرقہ، ہر نظریہ کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نئی گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے میں صوفیاء کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے اتیندر ناتھ بوس رقم طراز ہیں:

''اسلام نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر دستک دی۔ صوفیاء مساوات کا پیغام لے کر آئے۔ وہ ان تمام بندھنوں اور توہمات سے آزاد تھے جن کی وجہ سے کلاسیکی ہندوستان اور اسلامی مکاتب میں جمود طاری ہوگیا تھا۔ قدامت پسندی کے برخلاف نئے معاشرتی نظام نے مرجھائے ہوئے ہندوستانی معاشرہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دی جس سے تخلیقی قوتیں ظہور پذیر ہوئیں۔ انسانی اقدار پر مبنی ایک نیا فلسفہ وجود میں آیا جس میں روح انسانی کی روحانیت، محبت کی عالم گیریت اور انسانی جذبات کے عناصر شامل تھے''۔[7]

ہندو اور مسلم نظریاتِ تصوف

''ہندو اور اسلامی تصوف کے بنیادی نظریات میں کافی حد تک مماثلت ہے اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ البیرونی نے ہندو اور اسلامی تصوف کا موازنہ کیا اور پایا کہ سامکیا اور صوفیاء کے یہاں موجود جنت کا تصور یکساں ہے۔ اسی طرح موکش اور نجات کے نظریہ میں بھی کوئی فرق نہیں اور بایزید بسطامی اور پتانجلی میں مذکور وحدت الوجود در حقیقت ایک ہی ہیں۔''[8]

ادویت ویدانت اور وحدت الوجود ایک ہی سکہ کے دو پہلو ہیں۔ گوکہ بنیادی اختلافات کے باوجود دونوں کا نچوڑ یہ ہے کہ خدا تو ایک ہی ہے مگر دیگر

مخلوقات اس کے مظاہر ہیں۔ اس کے لئے ویدوں میں جو اصطلاحیں استعمال ہوئی وہ یہ ہیں: وِوارتا، پرتی بھاشا، پرتی بمب، جن کا ہو بہو اسلامی تصوف میں تجلی، ظہور، عکس اور نمود ہیں۔ تصوف میں روح اقدس کو ہم است یا پھر انا الحق سے موسوم کیا جاتا ہے جبکہ ویدانت میں اس کی اصطلاح تتوم اَسی یا اہم برہماسمی ہے۔ دھیان کا مترادف معرفت ہے اور جس راستہ سے یہ حاصل ہوتی ہے اسے بالترتیب مارگ اور طریقہ کہتے ہیں۔ ولایت کے مختلف مراحل کو مقامات یا بھومیکا کہا جاتا ہے۔ فنا اور بقا کے مساوی نِر وکلپ سمادھی اور مکتی ہیں۔ ہم ذیل میں چند وہ اصطلاحیں نقل کر رہے ہیں جو ویدانت اور تصوف میں مشترک ہیں:

نرگن برہم	ذات المطلق
وَ یکتا۔ اوَ یکتا	ظاہر۔ باطن
نِروپاہیکا سُپادھیکا	مطلق، مقید
سائی ستیم	حق و حقیقت
سادھکا اور سِدھ	سالک اور واصل
دھیان اور دھرنا	ذکر و مراقبہ
ستیسیہ ستیم	حقیقت الحقائق
جیوتسم جیوتی	نور الانوار

کیسا حسین اتفاق ہے کہ امام غزالی کی دنیاوی علوم اور دینی علوم کی

تفریق، ہجویری کی انسانی علم اور الوہی علم وغیرہ فلسفہ اپنیشد میں بھی موجود ہیں۔[9] ایسا گمان کیا جاتا ہے کہ ہندو فلسفہ میں اسلامی تصوف کی اسطلاحیں اس وقت داخل ہوئیں جب مسلم دور حکومت میں شنکرآچاریہ (م820) نے ویدانت کو منظم کیا اور رامانج (م820) نے بھکتی تالیف کی۔ بقول بارتھ دکن کے اُن علاقوں میں جہاں آٹھویں صدی عیسوی اور بارہوں صدی عیسوی کے درمیان عرب تاجرآ کر بسے تھے ان ہی علاقوں سے شنکر، رامانج، اننت تیرتھ اور باسوا اٹھے۔[10]

مگر بعض مورخین اس نظریہ کو درست نہیں قرار دیتے کہ شنکر اسلامی تصوف سے متاثر ہوئے کیوں کہ یہ سب تو پہلے سے ہی ویدوں اور اپنیشدوں میں مذکور ہے۔ شنکر تو بس ان کو اجاگر کررہے تھے۔ اس سلسلے میں بھٹا چاریہ کا تجزیہ صحیح معلوم ہوتا ہے جب وہ کہتے ہیں:

> ''ہندوازم پر مسیحیت اور اسلام کا کتنا اثر ہوا اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانا تو دشوار ہے۔ ہاں مگر جب مسلمان دکن میں آباد ہوئے تو اس سے یقینی طور پر ہندو مذہب میں بھی الٰہیات نے جنم لیا جس کے نقوش شنکر کے بعد کے بہت سے مصنفین کی تصنیفات میں نظر آتے ہیں''۔[11]

اسلامی تصوف کے اصول اتنے شاندار تھے کہ کٹر ہندو برہمن بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی انکشاف کرتے ہیں:

''چیتنیا کی سولویں صدی عیسوی میں لکھی گئی سوانح سے عیاں ہوتا ہے کہ پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں برہمنوں نے چند انحرافات کرتے ہوئے اسلامی طرز حیات اختیار کرنا شروع کر دیا تھا مثلاً داڑھی بڑھانا، عصیٰ رکھنا، فارسی پڑھنا، مثنوی کا مطالعہ وغیرہ''۔[12]

صوفیاء اکثر بادشاہوں کو ان کے غیر منصفانہ رویوں کو لے کر تنقید کا نشانہ بناتے تھے اور انہیں اپنی رعایا کے ساتھ انصاف کرنے اور بہتر سلوک کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ جب سلطان سکندر لودھی (1498-1517) نے ہندو مندروں کو منہدم کیا تو میاں عبداللہ اجودھنی نے اس کی سخت مخالفت کی۔ جب محمد بن تغلق نے خود کو سلطان عادل کا لقب دیا تو شیخ شہاب الدین حق نے تنقید کرتے ہوئے کہا، ''ظالم خود کو عادل کیسے کہہ سکتا ہے''۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے زندگی بھر سلاطین و امراء سے کنارہ کشی اختیار کی۔ ان کی حیات میں دہلی میں سات سات سلاطین آئے مگر آپ ایک سے بھی ملنے نہیں گئے۔ جب سلطان علاء الدین خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زیارت کا ارادہ کیا اور اس کی خبر آپؒ کو ہوئی تو آپؒ نے فرمایا میری خانقاہ کے دو دروازے ہیں۔ اگر سلطان ایک سے داخل ہوگا تو میں دوسرے سے نکل جاؤں گا۔ اورنگ زیب عالم گیرؒ نے شیخ عبدالرحمٰن کو جاگیر عطاء کی مگر آپؒ نے ٹھکرا دی۔[13]

خانقاہوں میں بلا تفریق مذہب و ملت لوگ پناہ لیتے تھے۔ خانقاہ کے

دروازہ ہر اس شخص کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے جو صوفی کے ساتھ کسی بھی درجہ میں منسلک ہونا چاہتا تھا۔ جب گُمبھا دیو اور بہرام خان کو محمد شاہ بہمنی سے شکست ہوئی تو ان دونوں نے زین الدین داؤد کی خانقاہ میں پناہ لی۔[14]

چند صوفیاء نے ہندو مذہب اور فلسفہ کا بغائر مطالعہ کیا۔ امیر خسرو ہندو رسوم کی تعریف بایں الفاظ کرتے ہیں:

''تم ہندوؤں سے سیکھو کہ عبادت کیسے کی جاتی ہے''۔[15]

''شیخ محمد گیسو دراز ہندو روایات سے بخوبی واقف تھے اور سنسکرت کے بھی ودوان تھے۔گوالیر کے محمد غوث کے ہندو سادھوؤں اور یوگیوں سے مراسم تھے اور انہوں نے ہندو فلسفہ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔محمد غوث نے یوگا پر لکھی گئی کتاب امرت کنڈ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔میر ابوالقاسم فندرسکی نے یوگ وششٹ کی شرح تحریر کی تھی اور اس کی تکنیکی اصطلاحوں کی حروفِ تہجی کے اعتبار سے فہرست بھی تیار کی تھی۔ شاہجہاں کے فرزند دارشکوہ ہندو سادھوؤں کی دل سے عزت کرتے تھے۔''[16]

داراشکوہ نے پچاس اپنیشدوں کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا اور ویدانت پر ایک وقیع رسالہ سنسکرت میں تحریر کیا۔ اسی طرح ویدانت اور تصوف پر کئی کتابیں فارسی میں تصنیف کیں۔ داراشکوہ کی شاہکار مجمع البحرین میں

ہندومت اور اسلام کی مشترکہ اقدار سے بحث کی گئی ہے۔ شیخ محمد افضل سرکش نے ہندو سادھوں کے آشرم میں پچیس دن قیام کیا اور ہندومت اور اسلام کے درمیان مماثلت پر مطالعہ کیا۔ سترہوں صدی کے عظیم صوفی شیخ حسین عنبر خان نے بھاگود گیتا کی مراٹھی میں تفسیر لکھی۔[17] بعض صوفیاء تو بھگوان رام اور بھگوان کرشن کو خدا کے پیغمبر مانتے ہیں۔ حتیٰ کہ خواجہ حسن نظامی جن کا تعلق حضرت نظام الدین اولیاء کے خانوادہ سے ہے انہوں نے تو با قاعدہ ایک کتاب بعنوان ''ہندوستان کے دو پیغمبر: رام اور کرشن'' تصنیف کی ہے۔ صوفی شاعر مرزا مظہر جانِ جاناں (1699-1780) ویدوں کو الہامی کلام تصور کرتے تھے اور ہندوؤں کو بھی اہل کتاب میں شمار کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے فرزند اور خلیفہ شاہ عبدالعزیز کو بھگوت گیتا نے بہت متاثر کیا تھا اسی لئے وہ کرشن کو ولی کہتے تھے۔[18]

غیر مسلم حضرات بھی صوفیاء کا بہت احترام کرتے تھے اور ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ سید سلطان احمد کے کثیر تعداد میں غیر مسلم مرید تھے۔ بلکہ غیر مسلم آپ کو لکھی داتا کے نام سے بلاتے تھے۔ لال شاہ باز قلندر کو غیر مسلم مریدین راجا بھارتی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ سندھ میں کلہورا راجاؤں کے ظلم وستم سے پریشان ہو کر جب غیر مسلم بھاگ رہے تھے تو شیخ عنایت شاہ نے اپنی خانقاہ میں ان پریشان حال ہندوؤں کو پناہ دی تھی۔[19] بابا فریدؒ کی عزت ہر مذہب والا کرتا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بابا فرید کے نعتیہ کلام کو پنجابی زبان میں

منتقل کر کے سکھوں کی مقدس کتاب آدی گرنتھ میں شامل کیا گیا ہے۔ چھتر پتی شوا جی مہاراج اور ان کے خاندان کا دکن کے صوفیاء سے خاص تعلق تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ شیوا جی کے دادا مولا جی کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ لہٰذا وہ دکن کے معروف صوفی شاہ شریف کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیٹا پیدا ہونے کے لئے دعاء کرنے کی درخواست کی۔ شاہ جی نے دعاء کی اور مولا جی کے دو بیٹے ہوئے۔ مولا جی نے ان دونوں بیٹوں کے نام شاہ جی کے نام پر شاہ جی اور شریف جی رکھے۔ شوا جی شاہ جی کے بیٹے ہیں۔[20]

اسلام میں عقیدہ توحید اور اخوت نے سب سے زیادہ ہندوؤں کو متاثر کیا۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی، ''اس امر سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ چودہویں اور پندرہوں صدی میں بھکتی تحریک کی قیادت ہندوؤں کے نچلے طبقات کررہے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو مسلم صوفیاء اور خانقاہی زندگی سے بے انتہا متاثر تھے۔ ہندو مذہب کی طویل تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا جب معاشرہ کے نچلے طبقہ سے چیتنیا، کبیر، نانک دھنا، دادو وغیرہ عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ بھکتی تحریک سے تعلق رکھنے والا شاید ہی کوئی ایسا سادھو ہو جس نے کسی نہ کسی خانقاہ میں وقت نہ بتایا ہو'' ۔[21] صوفیاء کے ذریعہ مورتی پوجا، شرک، ذات پات کی شدید مخالفت اور مساوات کا عملی نمونہ پیش کرنے کی وجہ سے ہندو بھکت خود بخود خانقاہوں میں کھنچے چلے آئے۔ اور یہیں سے ترغیب پا کر ہندو مذہب کی اصلاح کی جانب متوجہ ہوئے۔

انہوں نے مذہب پر برہمنوں کی اجارہ داری کے خلاف آواز اٹھائی۔ صوفیاء ہی کی مانند بھکتی رہنماؤں نے بھی علم کے بجائے بھکتی یعنی عبادت پر زور دیا اور اپنے دائرہ میں غیر برہمنوں کو بھی جگہ دی۔ ایک جانب صوفیاء کی تعلیمات تو دوسری جانب بھکتی تحریک کے اثرات کی وجہ سے عوام الناس میں مثالی بھائی چارہ پیدا ہو گیا۔ بقول شتی موہن سین، ''ہندوازم اور اسلام اپنی اپنی مذہبی کتب اور عقائد میں جکڑے ہوئے مذہب ہیں۔ یہ دریا کے وہ دو ساحل ہیں جو آپس میں کبھی نہیں ملتے ہیں۔ تو پھر اس خلاء کو کون پُر کریگا؟ قدامت پرست ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس کارخیر کے لئے ناموزوں ہیں۔ لہٰذا ہندو بھکتوں اور مسلم صوفیاء نے اس گہری کھائی کو پاٹا''۔[22]

یہ اور ساتھ میں مذہب اسلام کا تیز رفتار سے پھیلنے کے سبب صوفیاء کو اپنا مشن جاری رکھنے میں تقویت ملی جس کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بہت اچھے تعلقات قائم ہوئے۔ اسلام کی حقانیت، اعلیٰ اقدار، مساوات اور اخوت نے ہندو معاشرہ میں گہرے نقوش چھوڑے۔ صوفیاء نے جب علاقائی زبانوں میں روحانی کلام پیش کیا تو اس سے دونوں قومیں ایک دوسرے کے کافی قریب آ گئیں۔

سندھی میں شاہ لطیف (م 1690)، پنجابی میں بابا فرید، سید شاہ وارث، سلطان بابا اور علی حیدر، ہندی اور اردو میں امیر خسرو، ملا داؤد، گیسو دراز اور ملک محمد جائسی، بنگالی میں جلال الدین تبریزی، دولت قاضی، گجراتی میں شیخ گنج الاعلانی،

سید برہان الدین اور کشمیری میں محمود غنی اور خواجہ حبیب اللہ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

موسیقی کے میدان میں بھی صوفیاء نے خوب خدمات انجام دی ہیں۔ تصوف کے بعض سلاسل کو ادراک ہوگیا تھا کہ موسیقی کی ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کی جاسکتی ہے۔ امیر خسرو نے سب سے پہلی بار محفل سماع میں موسیقی کا استعمال کیا۔ ڈھولک اور ستار کی ایجاد کا سہرا آپ ہی کے سر جاتا ہے کم از کم چھ نئے اسلوب مثلاً قول، قلبانہ، نقش، گل، ترانہ اور خیال متعارف کئے۔

سید نظام الدین مدھونائک اور مخدوم بہاء الدین بنیس نے موسیقی پر کئی کتابیں اور رسائل تصنیف کئے۔ موسیقی کی تعلیم کے لئے مختلف جگہوں پر مقامی حکمرانوں کی سرپرستی میں اسکول بھی قائم کئے گئے تھے۔

❑❑❑

References:

1. A. Nizami, *Some Aspects of Religion and Politics in India During Thirteenth Century*, Delhi 1974, p. 261
2. Ibid. 261
3 . For details, Nizami, pp. 182-83
4. K.A Nizami, p. 197
5. Hasna Begum, Contributions of Muslim Saints lo Indian Culline, *Spirit of India* Vol II, p. 117.
6. Burhan Ahmad, *Mujaddid's, Conception of Tuwhid*, Lahore 1940
7. Adindranath Bose, *Cultural Heritage of India*, Voi. Ili, pp. 460-2
8. Al Biruni, *Kitab al Hindi, translation, (Al Biruni's India)*, London, 1910 pp. 87-88
9. W. Husain, *Conception of Divinity in Islam and Upanishads*, Calcutta 1939
10. A. Barth, *The Religions of India*, London 1921, pp. 209-11
11. V. N. Bhattacharjee, Majumdar, ed.,*The Struggle for Empire*, Bombay 1957, p. 459
12. Suniti KumarChattarji, *Spirit of India*, Voi. I, New Delhi, 1972, pp.91
13. FathullahMujtabi; *Aspects ofHindu Muslim Cultural Relations*, Delhi 1978, pp 100-101
14. *Tarikh - i- Ferishta*, Voi. I, p 294
15. Nizami, op. cit., p. 263
16. Fathullah Mujtabi, op. cit., P. 102
17. Ibid.
18. Ikram, Rind-i-Kawthar, Karachi, nd. 394, A. K. Aziz, Studies in *Islamic Culture in Indian Environment*, Oxford,1964, p. 139
19. Kshithi Mohana Sen, *Medieval* Mystic of North India, *Cultural Heritage of India*, Vol. IV, p. 389
20. Fathullah Mujtabi, p. 106
21. K.A Nizami, p. 264
22. *Cultural Heritage of India*, Vol.IV, p. 378

خسرو فاؤنڈیشن
ایک نئی پہل

ہندوستان، جنت نشان جو مذہبی، لسانی اور تہذیبی تکثیریت کا ملک ہے اور کثرت میں وحدت سے جس کی پہچان ہوتی ہے اور اس عظیم ملک کی تاریخ کا ہر دور انسان دوستی کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جس میں شکتی اور شانتی بھکتوں کے گیتوں کا نتیجہ ہے اور ہندوستان ہمیشہ اس بات کا گواہ رہا ہے کہ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔

پتہ نہیں کہ دنیا کو کس کی نظر لگ گئی کہ سماجی قربتیں، فاصلوں میں بدلنے لگیں ہیں۔ اس دیس کے باسیوں کی بڑی تعداد اگرچہ آج بھی اس عدم اتفاق اور تفریق کا حصہ بننے کو تیار نہیں لیکن غالب ترین اکثریت بھی اگر خاموش رہے تو وہ اس کے وجود کو عدم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اب زیادہ تر لوگ اپنی ذات کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ غم زمانہ کی جگہ دردِ تنہا سے دو چار ہیں اور وہ انسان جو کبھی ضمیرِ دشت و دریا تھا آج اسیرِ آشیانہ بنا ہوا ہے۔ ان

حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا جا سکتا اور اس لئے ضروری ہے کہ ایک بار پھر ان تمام علامتوں کو زندہ کیا جائے جو ''محبتوں کی گاتھا'' اور ''پریم کے ڈھائی اکچھر'' سے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رہے جن کے نزدیک مادرِ وطن، وہاں پیدا اور بسنے والے، اس کے دریاؤں کا پانی پینے والے، اس کے کھیتوں میں پیدا ہونے والے رزق سے اپنی بھوک مٹانے والوں کو پھر اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان کا مذہب، زبان اور علاقہ کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن ماں اور ماٹی سے ان کا رشتہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے اور چلانے والے رب کی مرضی کا نتیجہ ہے اور جس میں رب راضی اس میں سب راضی رہیں، تو ہی بہتری اور بھلائی ہے۔

ہندوستان میں ایک دوسرے کو جوڑنے والوں کا اگر ذکر کیا جائے تو ان کے نام اور کام گنانے میں کوئی دیر نہ لگے گی لیکن اگر ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والوں او ربانٹنے والوں کے نام کسی سے پوچھے جائیں تو اسے ان کے نام یاد کرنے اور بتانے میں بڑی مشکل آئے گی۔

اس سب کے باوجود آج پھر یہ دوریاں، یہ ٹکراؤ اور یہ تشدد بار بار کیوں دیکھنے کو مل رہا ہے؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ ہم نے انہیں بھلا دیا ہے جنہیں ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ دیوی دیوتاؤں، پیغمبروں، پیروں اور رشیوں مُنیوں کے تیاگ، تپسّیا، سمرپن اور سیوا بھاؤ کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے سندیش اور اپدیش ایک دفعہ پھر لوگوں تک پہنچائے جائیں۔

یہی وہ سوچ اور فکرمندی ہے جس کے تحت **''خسرو فاؤنڈیشن''** کی بنیاد رکھی

گئی ہے۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی وہ محبوب، دلنواز اور ہمہ گیر شخصیت ہیں جنہیں صدیاں گزر جانے کے باوجود یاد رکھا گیا اور ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ بیک وقت صوفی بھی تھے اور سپاہی بھی، وہ شاعر بھی تھے اور ماہرِ موسیقی بھی، وہ مؤرخ بھی تھے اور تاریخ ساز بھی۔ غرض ان کی شخصیت کی عبقریت نے ان کو گوں نا گوں صفات کا حامل اور ہمہ جہت پہلوؤں سے اس طرح متصف کیا کہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں بڑے بڑے نامیوں کے نشان مٹ گئے لیکن جب سے آج تک نہ صرف ہماری تاریخ کے جز بلکہ انسانی ذہنوں میں زندہ و تابندہ ہیں۔ مسرت کے لمحے ہوں یا یاس وغم کی گھڑیاں، خسرو کا نام اور کلام ہمہ وقت اپنی جاذبیت اور آفاقیت کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے۔

اس گتھی کو تو ماہرینِ نفسیات ہی سلجھا سکتے ہیں کہ خسرو نے کس طرح حال وقال، جنگ وجدل، سوز وساز، خانقاہ اور دربار کے درمیان توازن برقرار رکھا۔ یہ اس لیے بھی اہم ہیں کہ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے یہ توازن اپنی شخصیت کے کھرے پن کے ساتھ قائم کیا تھا۔ ان کی ہر وابستگی اور ہر رول کھلی کتاب کی طرح سب پر عیاں تھا اور اس کھلے پن کے تعلقات کے باوجود زندگی بھر کامیاب رہے۔ صدق بہ تدبّر کی مثالیں امیر خسرو کی شخصیت کو ہمارے لئے اور بھی آئیڈیل بناتی ہیں۔

اس ''ترک نژاد'' کی وطن دوستی نہ صرف مثالی، بلکہ قابلِ رشک بھی ہے۔ خسرو کے نزدیک یہ سرزمینِ ہند، عدن کی جنت، یہاں کے لوگ ہر رنگ میں انہیں عزیز، یہاں کے درباروں کے آگے ایران، توران، خراسان کے دربار ہیچ۔

یہاں کے لوگ ہر صنعت، علم وادب کی ہر شاخ، فنونِ لطیفہ کے ہر میدان اور عسکری تربیت کے ہر انداز میں ''بے نظیر'' اہلِ ہند کا توحیدی مسلک انہیں باوجود ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے عزیز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر چہ وہ (یعنی اہلِ ہند) ہمارے جیسا دین نہیں رکھتے، مگر ان کے اکثر عقیدے ہمارے جیسے ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستان، ہندوستان کی ہر روایت چاہے وہ مذہبی ہو چاہے تہذیبی، ثقافتی ہو یا لسانی، علمی ہو یا ادبی، اس کو خسرو کی طرح دیکھیں، اپنائیں، اس پر صدقے اور واری جائیں۔ خسرو جن کی ماں ہندی اور باپ ترک تھے، ایسے ہندوستانی ہیں جو ہندوستان کی عظمت کے ترانے ہی نہیں گاتے بلکہ وہ اپنے آپ کو اس مٹی کا اس طرح حصہ بن جانا چاہتے ہیں جیسے یہ مٹی ہی سب کچھ ہو اور جس سے تعلق اور محبت کو الطاف حسین حالیؔ نے یوں بیان کیا ہے:

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

خسرو فاؤنڈیشن وطن دوستی، انسان دوستی، فطرت سے ہم آہنگی، ہر طرح کی تفریق چاہے وہ فرقہ وارانہ ہو یا جنسی سب سے اوپر اٹھ کر محبت کو عام کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے کہ بقول شیخ ابراہیم ذوقؔ:

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

❑❑❑

مصنف کے بارے میں

ڈاکٹر حسین رنداتھانی صوفی نظریے کے حامی ایک معروف مورخ اور مصنف ہیں۔انہوں نے ہندوستانی تاریخ پر بہت کچھ لکھا ہے۔ان کا تعلق جنوبی ہندوستان کے ساحلی شہر ملاپورم سے ہے جو کہ ریاست کیرالہ میں واقع ہے۔انہوں نے ایم ای ایس کالج، منارکڈ اور کنہلی مارکر سینٹر، کالیکٹ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دیں ہیں۔ وہ M.E.S کالج، ویلانچیری کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔فی الحال وہ انسٹی ٹیوٹ آف مالابار ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ کے ڈائریکٹر ہیں۔تصوف، میپلا مسلمان، ہندوستانی تاریخ اور اسلام پر ان کی کئی کتابیں انگریزی اور ملیالم میں شائع ہو چکی ہیں۔

www.hussainrandathani.in